بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

اب سامنے ہے ماہِ جہاد!

حج جیسی عظیم عبادت کا مہینہ تو وحی سے مقرر کیا گیا اور وحی کے تحت ہی قرآن و حدیث میں اس کے پانچ دنوں کے لیے آداب، شعائر اور مناسک متعین کر دیے گئے۔

اب حج جیسی عظیم عبادت سے گزر کر ہم مسلمانانِ عالم ایک ایسے مہینے میں داخل ہونے والے ہیں جس کے لیے بروئے وحی تو کوئی خاص مقاصد و احکام متعین نہیں ہیں کہ اس مہینے کی یا اس کے ایامِ عاشورہ کی یہ حیثیت ہے اور اس کے لیے یہ اور یہ آداب و شعائر ہیں۔ ایامِ عاشورہ کے نفل روزے البتہ واقعۂ کربلا سے پہلے سے رائج چلے آرہے تھے۔ اس مہینہ کو اہمیت انسانی تاریخ کے ایک بڑے واقعہ اور انسانی کردار کے اعلیٰ اور اسفل دونمونوں کے تقابل سے ملی ہے۔

کتنے ہی اصحاب کے نزدیک یہ ماہِ ماتم ہے، مگر میں سوچ سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ماہِ جہاد ہے۔ حج کی عبادت جس کے مراحل بہ حیثیت مجموعی جہاد آموز ہیں، اس کے فوراً بعد ہماری تاریخ کا ہمارے سامنے اسلاف میں سے ایک روشن ستارے اور اس کے رفقا کے انقلابی کردار کو نمایاں کر دینا اور اس کے بالمقابل تاریکیٔ فکر و عمل کے ایک پیکر شہنشاہیت کے ساتھ تشدد کیش درباریوں اور فوج کی جبریت کا منظر دکھانا ایک ایسے نقطۂ فکر و احساس پر لاکھڑا کرتا ہے جہاں ایک طرف دنیا اور اس کی لذتیں ہیں جن کے حصول کے لیے صرف اپنے دل کی روشنی کو گل کرنا، اپنے ضمیر کو پتھر بنانا اور اپنے چہرے پر ذلت کی کیچڑ کا لیپ کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف ایمان ہے اور اخلاق کی بلندیاں ہیں، کردار کی تابانیاں ہیں، جذبۂ جہاد کی سرشاریاں اور ایثار و فدائیت کی سرمستیاں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہے، جس کا ایک مظہر جنت کی دائمی زندگی بھی ہے، مگر اس طرف جانا ہو تو اپنے ہی لہو کی [illegible] میں ڈوب کر جانا پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زندگی کے یہ دو ہی اصولی راستے بنائے ہیں: ایک دنیا پرستی اور جبر کیشی کا راستہ، دوسرا خدا پرستی، دعوتِ حق، جہاد، صبر اور عزیمت کا راستہ۔ وہ انسانی پستی کا اظہار ہے اور یہ انسانی عظمت و سربلندی کا۔

اوّل الذکر راستے پر چلنے والے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے بھی بے جان متحرک لاشوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ مؤخر الذکر راستے کے راہی مرنے کے بعد بھی زندہ رہ جاتے ہیں۔ اور ان کا مقصد اور پیغام تاریخ کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ مقامِ ماتم کدھر ہے اور مقامِ فخر کدھر؟ ہار کس کی ہے اور جیت کس کی؟

امام حسینؓ نے تو ایک درسِ جہاد ہمارے لیے کربلا کی ریت کے ذرّوں پر اپنے خون سے لکھا تھا، آج ضرورت اس درس کو پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ہے۔

یہ بیان کہ وہ مکہ سے نکلے تو وہ جہاد کے ارادے سے نہیں نکلے تھے اگر جہاد کے لیے نکلتے تو اور صدہا ساتھیوں کو ساتھ لیتے، اُلٹا جو ساتھ چلے تھے، ان کو بھی واپس چلے جانے کی تلقین تادمِ آخر کرتے رہے۔ نیز امام کی طرف سے تین شرطیں پیش کی گئیں جن کو نامنظور کر کے دشمن قوت نے جنگی صورتِ حال اور انتہائی بہیمیت کی فضا پیدا کر دی۔ اس میں اگر جہاد کے معانی کو قتال کے معنی سے وسیع تر کر دیا جائے تو امام حسینؓ کا ملوکیت کی راہ پر چلنے والی یزیدی حکومت کے خلاف انکارِ بیعت کرنے سے لے کر، اس کی معاشرت و ثقافت پر تنقید کرنے تک، اور ترکِ قیامِ مکہ سے قربانیٔ کربلا تک، امام کی ساری کی ساری سرگرمیاں جہاد کی تھیں۔

امام کے سامنے حکومتِ اسلامی کے جمہوری طریقِ خلافت کو بدل دیا گیا تھا، مسلمانوں کے بیت المال کو دھڑلے سے لٹایا جا رہا تھا، رقص و سرود کی سرگرمیوں میں دربار کی خصوصی سرپرستی سے اضافہ ہو رہا تھا، امارت اور عہدوں کے لیے معیارِ تقویٰ کی قرآنی شرط ٹوٹ چکی تھی، عوام کی دینداری کے باوجود طبقۂ خواص نے لادینیت کے لیے راستے کھول دیئے تھے، قانونِ شریعت کو مقامِ اوّل سے اُٹھا کر کہیں ساتویں درجے میں پھینک دیا گیا تھا۔ یہ خوفناک تبدیلی جس کا نام یزید کے نام پر ہر دور میں یزیدیت ہونا چاہیے اس کے خلاف امام حسینؓ کی مجاہدانہ دعوت و تحریک کا منشا یہ تھا کہ حکمران طاقت میں تبدیلی نہ بھی آئے تو کم از کم عام مسلمانوں اور ان کے سربراہوں کے جذبوں میں ایک نیا اُبھار پیدا ہو۔

واقعہ ایسا تھا جیسے تاریخ کی جھیل میں بہت بڑی چٹان پھینک ماری جائے۔

ایسا نہ تھا کہ ہزاروں صحابہ کرامؓ اور عوام کے دیگر نیک نہاد نیش روؤں کی توجہ اس مسئلہ پر نہ تھی۔ مگر جس سختی سے عوام کو جبر و تشدد سے خوف زدہ کیا گیا تھا اور اشرفیوں کی چھنا چھن سے جو جادو طاری کر دیا گیا تھا، زعما اس کی گرفت سے عوام کو نکالنے کے راستے سوچتے تھے اور سناٹا کہہ رہا تھا کہ آگے یا پیچھے کسی نہ کسی ہستی اور گروہ کے ذریعے کوئی تحریک اُٹھنے والی ہے۔ امام حسینؓ کا شرف یہ ہے کہ وہ پہل کر گئے اور "بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق" والی بات ہو گئی۔

لوگوں نے کربلا کو فرقہ وارانہ جھگڑوں یا فی سبیل اللہ فساد کا موضوع بنا لیا، حالانکہ وہ فی سبیل اللہ جہاد کا ایک سبق تھا!

(۲)

اِس مضمون کے آغاز میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نہ مجھے حکمراں گروہ سے یہ اُمید بے جا ہے کہ وہ اسلام کے تقاضوں کو ایسی مؤثر شکلوں میں لانے پر تیار ہو سکتا ہے کہ اسلامی حدود و اقدار کا عملاً احیا ہو، نہ اپوزیشن کے کسی گروہ کے متعلق ایسے کسی مغالطے میں میرا دل مبتلا ہے کہ لہٰذا میں جو گفتگو کر رہا ہوں اس سے کسی کا یہ نتیجہ نکالنا ایک زیادتی ہو گا کہ میں اول الذکر کا ساتھی ہوں یا مؤخر الذکر کا مخالف۔ میرے سامنے معاملہ کسی ایک جماعت اور دوسری جماعت کا نہیں ہے بلکہ میں دو طرفہ متخالف طاقتوں کے باہمی تعامل و تصادم سے پیدا ہونے والے حالات پر گفتگو کر رہا ہوں۔

یہودیوں کے پروٹوکول میں جمہوریت کو مخالفین (غیر یہودی لوگ یا گوئم) کے لیے ذریعہ تخریب و انتشار بنانے کا جو پروگرام میں نے کبھی پڑھا تھا اس کے باوجود مجھے یہ توقعات رہیں کہ ہم مسلمان اگر خدا پرستی، اخلاق اور مساوات کے گراں قدر اصولوں کے فریم میں جمہوری سسٹم کی نئی تشکیل کر سکیں تو یہودیوں والی اسکیم اور بعض مغربی فلسفیانِ سیاست کے اندیشوں، نیز بڑے بڑے فتنہ آفرین سامراجی ممالک کے ہمت شکن تجربات کے گھیرے سے ہم نکل سکتے ہیں۔ یہ امید اس وقت فزوں تر ہو گئی جب ملک کے نمائندہ جید ۳۳ علماء نے مختلف مکاتب فکر سے

متعلق ہونے کے باوجود ۲۲ دستوری نکات کی بنیاد پر جمہوریت کا ایک خوبصورت خاکہ پیش کیا۔ بیچ میں ہزار خرابیٔ احوال کے باوجود اپنے پاکیزہ تصوّرِ جمہوریت کی کامیابی کا یقین میرے اندر کبھی ڈوبا نہیں۔ اور نہ میں نے بعض دوسرے اصحاب کی طرح ترکِ جمہوریت اور غیر جمہوری شورائی نظام کے تصوّرات کی رَو میں کبھی غوطے کھائے۔

البتہ میری جمہوری خوش خیالیوں پر پہلی زد اس وقت پڑی جب صدر ایوب صاحب کے دَور کے آخر میں کشتی ڈانواں ڈول ہونے لگی اور مارشل لا کا بادبان ناکارہ ہو گیا۔ اُس وقت جمہوریت کو سیاسی لیڈروں کی ایک قومی کونسل کی شکل میں ایوانِ صدر میں طلب کیا گیا۔ یہ بہترین موقع تھا کہ جمہوریت آگے بڑھتی، اقتدار پر قابض ہوتی اور جبریت اور تخریب و انتشار کی فضا کا خاتمہ کر دیتی۔ مگر اس موقع پر ایک صورتِ واقعہ ایسی پیش آئی کہ جمہوریت کی رُوح پہلی سانس لیتے ہی پرواز کر گئی۔

مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ تمام کے تمام لیڈروں کو جمع کیا جانا چاہیے۔ قطع نظر اس سے کہ مُلک کی وحدت و سالمیت یا اسلامی اقدار کے متعلق ان کا نظریہ و عمل کچھ بھی ہو۔ جمہوریت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ "سب کے سب"! اِس طرح ایک بڑا مجبورانہ مقام سامنے آیا اور جمہوریت کے لیے تباہ کُن ایسے ہی مجبورانہ مقام ہوتے ہیں۔ ہماری موجودہ جمہوریت جب ایک بار "سب کے سب" کا اُصول اختیار کر لیتی ہے تو پھر اس کا کوئی نظریہ نہیں رہتا۔ اور اس کا کوئی اخلاقی معیار نہیں رہتا۔ وہ اگر غلط الفکر اور تخریبی عناصر بلکہ چوروں اور ڈاکوؤں (یا اُن کے سرپرستوں) کو ساتھ لے کے نہ چلے تو سرے سے کام چلتا ہی نہیں۔ اور ان کو ساتھ لے کے چلے تو پھر کوئی اُصول اور مقصد سلامت نہیں رہتا۔ شیخ مجیب کا معاملہ عجیب پیچیدگی لے کے آیا۔ ایک طرف اس کا رویّہ وہ تھا جس سے بنگلہ دیش کے تصوّر کی آبیاری ہو رہی تھی اور ساتھ ہی وہ اگرتلہ سازش کیس کے تحت عدالت میں پیش تھا۔ مگر مصلحتی سیاست نے کہا کہ اسے پیرول پر رہا کر کے یہاں لایا جانا چاہیے۔ اور لایا گیا۔ لیکن عملاً واقعات نے یہ شکل اختیار کی کہ کارروائی کی سماعت کرنے والی ہستی ایس اے رحمٰن مرحوم کو تو جوتے چھوڑ کر جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑا۔ اور جس مجرم کا معاملہ زیرِ سماعت تھا وہ صدر ایوب

کے پہلو میں بیٹھا مرکز توجہ بنا ہوا تھا۔ صدر ایوب اُس وقت بے دم ہو چکے تھے، پورے جمہوریت نواز لیڈروں میں سے کوئی نہ تھا جو مجیب سے پوچھ سکتا کہ جناب کیا کیا کہتے اور کرتے پھر رہے ہیں، ذرا اپنی پوزیشن سیاسی پنچایت کے سامنے واضح تو کیجیے۔ بخلاف اس کے دولتانہ صاحب کی امامت میں سب کے سب خوشامد میں لگے تھے۔ جس نظام میں مجرم (اور حقیقی مجرم) قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھے اور اسے خود قوم کے سیاسی اکابر نیازمندی سے بلا کے زینت محفل بنائیں اور جس کا جج جوتیاں چھوڑ کر، ایک بنیان میں جان بچانے کے لیے قیام گاہ سے نکل بھاگے اس کے اگر تمام ذہین لیڈر دس سال تک بھی اپنی ناک رگڑتے رہیں تو اس میں سچی جمہوریت نہیں آسکتی۔

اِس محفل آرائی فائدین کا نتیجہ کیا نکلا، ایک اور فوجی آمر (جس کے مقابلے میں صدر ایوب دس گنا زیادہ شریف تھا) نے مارشل لا کے پچکے ہوئے غبارے میں پھر پھونک بھری۔ اس نئے آمر کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے مارشل لا کی چھتری کے نیچے ایسے طریقے سے انتخابات کرائے کہ بھٹو صاحب اور اُن کی پارٹی برسرِ اقتدار آگئی اور اس نئی قوت نے "دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب" کا وہ سماں پیدا کیا کہ جمہوریت کُشی کا حق ادا ہو گیا۔ نعرہ پھر بھی یہ رہا کہ "جمہوریت ہماری سیاست ہے"۔

اسی سلسلۂ احوال کا تکمیلی عملی وہ تھا کہ قومی اسمبلی کا ایک اجلاس سابق مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) میں منعقد ہونا تجویز ہوا اور اس پر بھٹو صاحب نے اعلان کیا کہ جو شخص مغربی پاکستان سے اُس اسمبلی میں شرکت کے لیے جائے گا ہم اس کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔ کیا جمہوریت میں ٹانگیں توڑنے کی بھی گنجائش ہے؟ چونکہ یہ گنجائش نہیں تھی اس لیے ملک کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔

کتنا مایوس کُن تجربہ تھا!

بیچ کا دور چھوڑ کر میں تازہ صورتِ حالات کو لیتا ہوں۔ ووٹوں کے زور سے جس کا جی چاہے، حکومت پر قابض ہو اور جس کا جی چاہے اپوزیشن کا کردار ادا کرے، مگر کسی کو حق نہیں کہ گالی سے لے کر گولی تک استبداد کی کسی بھی غیر انسانی صورت کو سیاست میں داخل کرے۔

مگر یہ ستم بھی ہوا۔

مجھے اگر اجازت ہو تو میں صاف صاف کہوں کہ جس طرح کے انتخابات اور جس طرح کے جوڑ توڑ سے حکومت اور اس کے ادارے بنے ہیں۔ ان حالات میں جمہوریت لازماً کمزور ہوئی ہے۔ لیکن اس کے جواب میں جو طوفانی اپوزیشن اُٹھی اُس نے پہلے دور میں مصنوعی ہیجوموں کے ذریعے پوری قوم کو بھی اور اُس کی حکومت کو بھی دھمکانا چاہا کہ ہم ایسی عوامی طاقت لے کے آرہے ہیں جو تخت اُلٹ دے گی۔ اس کے ساتھ نہایت کثرت سے بدترین گالیاں جمہوریت کے دامن میں ڈالیں، عوام کے مذاق کو خراب کیا اور اخلاق کی سطح کو گرایا۔ پھر صاف صاف دھمکیاں دیں کہ ہم چاہیں تو گورنمنٹ ہاؤس اور تمام دوسرے اداروں کو جلا کے راکھ کر دیں۔ اپوزیشن کی جمہوریت مسلح دستے لے کے سامنے نکلی۔ دوسرے دور میں ملکی قوانین اور امن عامہ پر اپنی سابق دھمکیوں کے مطابق عمل کیا اور پھر جب حکومت نے روک تھام کرنا چاہی تو اُسے مجرم قرار دیا۔

اِس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ آئندہ بھی جو کوئی حکومت پر قابض ہو تو اُسے مجرم سمجھ کر بات کی جائے اور جو کوئی اپوزیشن میں ہو وہ اگر عوام کی جان و مال کی تباہی کا باعث بھی بنے تو اُسے خادمِ قوم قرار دیا جائے۔

کیا اِس قسم کی سیاسی ذہنیت اور اس قسم کے طریقوں کے ساتھ کبھی بھی سچی جمہوریت اور اس کے پہلو بہ پہلو امن اور شرافت ظہور کر سکتے ہیں، بعض بنیادی تبدیلیاں کیے بغیر یہ ہرگز ممکن نہیں۔

اسلام کے اُصولوں کے مطابق ایک اچھے نظام جمہوریت کی تشکیل کے لیے جن بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے وہ ہم ۱۹۵۰ء سے پہلے اپنے لٹریچر میں واضح کر چکے ہیں اور ان باتوں کو موقع بہ موقع پھر واضح کریں گے۔

لیکن یہاں چند ایسی اصلاحات کا ذکر کیا جاتا ہے جو اُوپر کی سطح پر ہو جانی چاہئیں۔

ایک یہ کہ حکومت کے عمائد اور اپوزیشن کے سیاسی لیڈروں کے اتفاق رائے سے ایک ضابطۂ اخلاق بننا چاہیے، جس میں مختلف ضروری باتوں کے ساتھ یہ بھی طے کیا جائے کہ کوئی شخص یا گروہ کسی شخص یا گروہ کو گالی نہیں دے گا، کوئی کسی کو جانی و مالی نقصان پہنچانے کی دھمکی نہیں دے گا۔ کسی کو حق نہ ہوگا کہ وہ قومی اور حکومتی املاک کی تباہی میں حصہ لے۔ ہر ایک اپنے اپنے پروگرام یا اپنے اجتماعی حسنِ اخلاق اور حسنِ خدمات کی طرف عوام کو دعوت دے گا۔ یہ بھی طے ہونا چاہیے کہ ایک ہی شہر میں، ایک ہی تاریخ میں مختلف جماعتوں کے جلسے، جلوس اور مظاہرے بالعموم نہیں ہونے چاہییں اور کوئی لازمی ضرورت پیش آجائے تو اوقات اور راستوں (ROOTS) کا اس طرح تعین کیا جائے کہ اشتعال اور ٹکراؤ کی صورت پیدا نہ ہو، بلکہ اُلٹا سمجھوتہ یہ ہونا چاہیے کہ ایک دوسرے کے افراد کو مدد دی جائے اور آرام پہنچایا جائے گا اور رہنمائی کی ضرورت ہو تو رہنمائی دی جائے گی۔

اسی طرح اخبارات اور سرکاری ذرائع ابلاغ کے کارپردازوں کو اپنے ضابطۂ اخلاق میں یہ طے کرنا چاہیے کہ ایک تو حقیقی خبروں کو چھپایا نہ جائے، دوسرے ہنگاموں یا تصادموں کی خبریں، تصویریں اور سرخیاں اس طرح نہ دی جائیں کہ کسی فریق کے خلاف کسی دوسرے فریق میں ردِعمل اُبھرے۔ ذرائع ابلاغ کی پالیسی یہ بھی ہونی چاہیے کہ جس طرح حکومت کی طرف سے جبر ہونے پر اُس کے خلاف نوٹ لکھے جاتے ہیں، اپوزیشن کی طرف سے گندی زبان استعمال ہونے پر، دھمکیاں دینے پر، اشتعال انگیزی اور تصادم انگیزی کرنے پر مسلح دستوں کو ساتھ لے کر سیاسی جلسوں اور مظاہروں کا انتظام کرنے اور پھر پبلک کے سامنے اسلحہ کا مظاہرہ کرنے پر سخت تنقیدی نوٹ لکھے جائیں۔

تیسرا سمجھوتہ وزارتی و پارلیمانی اکابر، سیاسی لیڈروں اور اخباری حضرات اور سرکاری ذرائع و ابلاغ کے کارپردازوں میں یہ ہونا چاہیے کہ اسلامی عقائد و شعائر، اس کے سیاسی و معاشی نظام، اس کے نظامِ تعلیم و اخلاق یا قانونِ حدود و تعزیرات یا ضابطۂ حجاب پر حملے نہ کیے جائیں، اسی طرح پاکستان، سالمیت پاکستان اور نظریہ پاکستان کو مجروح نہ کیا جائے۔ اِن مباحث کے متعلق نہ ادارتی کالم استعمال کیے جائیں، نہ دوسروں کے مضامین و مقالات

اور انٹرویوز شائع کیے جائیں۔ بلکہ اسلام کے متعلق انتشار انگیز، اور اسلام کے علمائے سلف کے متعلق توہین آمیز اور علمائے حاضر کے متعلق پُر تضحیک اندازِ بیان پر بھی سخت گرفت کی جائے۔ اِسی طرح نظریہ پاکستان، پاکستان، وحدت و سالمیتِ پاکستان اور استحکامِ پاکستان کے خلاف اگر کسی جانب سے ناوک اندازی ہو رہی ہو تو ہمارے اسٹیج اور پریس اور نشری اداروں کو بغلیں نہیں بجانی چاہئیں، بلکہ ایسی مثالوں کے خلاف نفرت و بیزاری کا اظہار کرنا چاہیے۔

یہ چند اصلاحات وقتی ضرورت کی ہیں یا یوں سمجھیے کہ فسٹ ایڈ کی نوعیت رکھتی ہیں کسی دوسرے موقع پر یہ واضح کیا جائے گا کہ اس جمہوریت میں کن بنیادی تغیرات کی ضرورت ہے۔ جن کے بعد جمہوری نظام اسلام کے بارِ امانت کو اُٹھا سکتا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ موجودہ فتنہ انگیز جمہوریت جو ایک جبریت سے نکال کر ہمیں دوسری فسطائیت تک لے جاتی ہے، آخر اس کے ساتھ ہم کیوں چل رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم جس طرح موجودہ بگڑے ہوئے معاشرے کے ساتھ چل رہے ہیں اور ہمارا منشا جس طرح کسانوں اور دکانداروں اور اُستادوں اور طلبہ میں دعوتی کام کرنے کا ہے، اسی طرح جمہوریت میں بھی ووٹروں کے اندر اور پارلیمانی محفل کے اندر بھی دعوت کا کام کرنے کا کام ہے —— اور ہم اسلام کے دائرۂ اثر کو بڑھانے کے لیے کوشاں ہیں۔

ہماری نگاہیں اگر اس امر پر مرتکز نہ رہیں اور ہم بھی بے اُصول گروہوں کے مصلحتی جوڑ توڑ کے روزمرہ کے چکروں میں نت نئی اسکیمیں سوچنے اور نت نئی بولیاں بولنے پر اُتر آئیں تو موجودہ بیمار جمہوریت ہمیں بھی بیمار کر سکتی ہے۔ اللہ سے دُعا ہے کہ ہمیں بیمار نہ بنائے، چارہ گر بنائے۔